مقالۂ افتتاحیہ

# انسدادِ جرائم

: رئیس احمد جعفری

جرائم کی روک تھام کے لیے بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جرائم کم نہیں ہوتے۔ آخر کیوں؟

انسان بالطبع جرائم پیشہ نہیں ہے۔ فطری طور پر انسان بد نہیں ہے۔ انسان کی فطرت جرم سے نفرت کرتی ہے، بدی کو ناپسند کرتی ہے۔ با ایں ہمہ وہ جرم بھی کرتا ہے اور بدی سے بھی اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔

دنیا نے، اور دنیا کی تقلید میں ہم نے جرم اور بدی کے مؤثرات و محرکات اور عوامل پر اتنا غور نہیں کیا جتنا کہ سوسائٹی کے گنہگار کو سزا دے کر، بلکہ اس سے انتقام لے کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیں۔ تعزیر و عقوبت بھی اپنی جگہ ایک چیز ہے۔ لیکن اگر اسی کو اصل سمجھ لیا جائے تو نتائج خاطر خواہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ سچ پوچھیے تو جرائم کی ذمہ داری جہاں مجرم پر ہے سوسائٹی پر بھی ہے۔ بدی کا سرچشمہ صرف ایک زشت کار ذہن و عمل ہی نہیں ہے۔ سوسائٹی کے وہ عوائد اور آداب حیات بھی ہیں جو اسے جرم پر اکساتے اور بدی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ پہلے اس کا تدارک ہونا چاہیے پھر مجرم کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد یقیناً نتائج حسب دل خواہ برآمد ہوں گے۔

اس سلسلے میں جو کام پوری توجہ اور انہماک سے کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد جرائم بھی کم ہو جائیں گے اور مجرموں کی تعداد بھی گھٹ جائے گی۔

دوسری توجہ طلب چیز یہ ہے کہ مقصد صرف یہ نہ بنا لیا جائے کہ جس طرح ممکن ہو بدکردار لوگوں کو تعزیر و عقوبت کا نشانہ بنایا جائے۔ ان کی اصلاح بھی کی جاسکتی ہے، اور اصلاح کے بعد وہ معزز، پُرامن اور مفید مطلب شہری بھی بن سکتے ہیں۔

اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اصلاح اخلاق اور تزکیہ، کردار کی عام سعی و کوشش۔ جس سے لوگوں کے دل میں خدا کا ڈر پیدا ہو۔ انسان اپنے مقام سے واقف ہو۔ اور ان راستوں سے گریز کرے جو فتنہ و شر کا سبب بن سکتے ہیں۔

یہ کام صرف مسجدوں میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے اخبارات کو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ دانشوروں کو مصروف کار ہونا پڑے گا۔ سیاست دانوں کو اپنے انداز بدلنے پڑیں گے۔ ارباب اقتدار اور اصحاب اختیار کو اپنے زاویۂ نظر میں تبدیلی کر کے اصلاحی مساعی کو بروئے کار لانا پڑے گا۔

لوگ مذہب سے اور اس کے اقدار سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کی مجرمانہ ذہنیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے سے بڑا قانون اور بڑی سے بڑی سزا بھی وہ کام نہیں کر سکتی جو خوفِ خدا کر سکتا ہے۔ اور خوفِ خدا کے لیے مذہب کو، ذہنی، فکری اور عملی طور پر رگ و ریشے میں پیوست کر دینے کی ضرورت ہے۔

آخر اس کا کیا سبب ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے دن دہاڑے اغوا ہو رہے ہیں۔ کم سن اور نوجوان لڑکیاں غائب کی جا رہی ہیں۔ اور بردہ فروشی کا کاروبار پوری وسعت کے ساتھ جاری ہے۔ خواتین اور لڑکیوں پر مجرمانہ حملے یوماً فیوماً بڑھ رہے ہیں۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں، ناموس محفوظ نہیں، جان اور مال محفوظ نہیں۔ قتل ہوتے ہیں۔ چاقو چلتے ہیں۔ گولیاں چلتی ہیں، مگر مجرموں کا سراغ یا تو لگتا نہیں یا اگر لگتا ہے تو اتنی سست رفتاری سے کہ انھیں کیفر کردار تک پہنچنے میں ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔

لیکن جب مذہب کا وقار قائم تھا اور وہ اپنی اصلی جگہ متمکن تھا۔ تو کیا یہ امر واقعہ نہیں۔ اور تاریخ اس کی شاہد نہیں ہے کہ بڑے سے بڑا مجرم خود قاضی کے ایوان میں پہنچ جاتا تھا۔ اپنے جرم کا اقبال کرتا تھا۔ اور اپنے "پاک" کرائے جانے، یعنی موت کی سزا پانے پر اصرار کرتا تھا۔ اسے مہلت ملتی تھی۔ اسے اقبالی بیان سے منحرف ہو جانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی بات پر اڑا رہتا تھا۔ اسے اس وقت تک قرار نہیں آتا تھا جب تک وہ "پاک" نہ کر دیا جائے۔ یعنی اس کی جان نہ لی جائے۔ اور اس میں مرد عورت کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ سب اس جرأت و ہمت کا مظاہرہ کرتے تھے، اور اپنے اعمال و افعال کے نتائج بھگتنے پر آمادہ اور بضد رہتے تھے۔ یا تو وہ حال تھا یا یہ کیفیت ہے کہ بڑے بڑے اقدامات مشتہر کیے جانے کے باوجود مفرور مجرم برآمد نہیں ہوتے۔ نہ سوسائٹی میں اتنی جرأت ہے کہ ان کی نشاندہی کرے نہ خود ان میں خدا کا اتنا خوف ہے کہ عارضی زندگی کی کلفت برداشت کر کے دائمی زندگی پرسکون بنالیں۔

ایک مرتبہ زنا کے ایک مجرم کو جب آخری سزا دی گئی تو بعض لوگوں نے اس کے بارے میں درشت اور نامزا الفاظ استعمال کیے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا:

"خبردار ـــــ یہ شخص اب (سزا پانے کے بعد) اتنا ہی پاک ہے جتنا ایک نوزائیدہ بچہ"!

یہ واقعہ غیروں کی تاریخ کا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری تاریخ کے ناقابل فراموش صفحات کا ایک صفحہ ہے۔

کیا اس میں کوئی عبرت، کوئی سبق، کوئی ہدایت نہیں ہے؟

ضرورت ہے کہ ہمارے مفکر، دانشور اور اصحاب اقتدار و اختیار ایک مرتبہ سر جوڑ کر بیٹھیں، اور ایک ایسی اسکیم وضع کریں جو ایک طرف تو سوسائٹی کے اصلاح احوال کی

ضامن ہو، دوسری طرف افراد و اشخاص کی ذہنی اور فکری تربیت کا بار بھی اپنے ذمے لے۔ اس طرح ہم پاکستان کو ایک مثالی حکومت بنا سکتے ہیں۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتے" تو ہمارے دعوے کوئی وزن نہیں رکھتے ——— گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں۔"